سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور ۲۶

ضرورتِ مذہب

از قلم حقیقت رقم :-

سرکار سیّد العلماء علّامہ علی نقی النقوی
مجتہد العصر لکھنؤ

قیمت ۲ر آنے

امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور

کی تبلیغی خدمات کا شاہکار "ضرورتِ مذہب" آپکے زیرِ نظر ہے" مذہب" انسان کی سب سے بڑی زندہ ضرورت ہے جسکی اہمیت خود انسان کے عین وجود اور شرفِ انسانیت سے کسی طرح کم نہیں۔ مگر جب کچی عقل کی ادھوری تعلیم پر شیطانی سیاست کا گمراہ کن وار چل جاتا ہے تو مغرب زدہ نوجوان دنیا کی سب سے بڑی بے وقوفی کا اعلان ان الفاظ میں کرتا ہے کہ "مذہب کی ضرورت نہیں"

دورِ الحاد میں اس نعرۂ کافری کو مسلمان بنانے کیلئے اسکو منفی سے مثبت بنانے کی ہر کوشش عند اللہ مشکور ہے۔ اسی مقصد کیلئے سرکار سید العلماء حجۃ الاسلام مجتہد زمانہ علامہ علی نقی النقوی مدظلہ کی یہ گرانقدر کاوش قلمی کا معنی خیز صحیفہ تبلیغی شائع کیا جا رہا ہے جس میں مذہب کی تعریف، نوجوان کی مچلتی ہوئی خواہشِ آزادی کا تجزیہ، آزادی کیلئے پابندی کا عالمگیر منطقی لزوم، نجات و فلاح دارین کیلئے کتابی ہدایت کا ناکافی ہونا انسان کی رہبری اور رہنمائی کیلئے ناطق قائد کی لازمی ضرورت، کتابِ خدا کے ساتھ قرآن ناطق کی حاجتِ لاینفک اصول دین میں عقل اور فروع دین میں تقلید کی ضرورت پر دلنشین انداز سے کامیاب کوشش فرمائی گئی ہے۔

ضرورت ہے کہ تبلیغ مذہب کے لئے اس کتابچہ کی نوجوانوں میں وسیع پیمانے پر اشاعت کی جائے۔

امامیہ مشن کی تبلیغی تنظیم میں شمولیت آپکی زندگی کے نتیجہ خیز کاموں میں اہم کارنامہ شمار ہوگا

خادمِ دین:۔

سید حسن علی شاہ کاظمی سیکرٹری امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ، اردو بازار، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ سیّد الانبیآء والمرسلین وآلہ الطیبین الطاہرین

موجودہ زمانے میں ایک آواز ہے، جو مختلف اطراف سے بلند ہے وہ یہ ہے کہ مذہب کی کوئی ضرورت نہیں۔ مذہب ایک افیون ہے مذہب کو ختم کرنا لازم ہے۔ مگر میری سمجھ میں اس کا مطلب ہی نہیں آتا۔ "مذہب کی ضرورت نہیں" اس کے معنی کیا ہیں؟

مذہب تو وہ راستہ ہے جسے انسان صحیح سمجھ کر اختیار کرے۔ ہر چیز جس کا تصوّر ہو اس میں دو پہلو لازم ہیں۔ نفی اور اثبات۔ وہ باتیں جنہیں اسلام یا کوئی بھی دین پیش کرتا ہے ان میں بھی یہ دونوں پہلو لازمی ہیں۔ اب ان پہلوؤں پر غور کر کے انسان جس نتیجہ تک پہنچے، ثبوت کو اختیار کرے تو وہ اس کا مذہب ہوگا اور نفی کو حقیقت سمجھ کر قبول کرے تو وہ اس کا مذہب ہوگا۔ پھر "مذہب کی ضرورت نہیں" اس کا مطلب کیا ہوا؟

ہاں اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ واقعیات کی حقیقت تو ختم نہیں ہو سکتی، وہ خواہ وجود ہو اور خواہ عدم وجود۔ مگر اس بارے میں غور و فکر کیوں کیا جائے؟

اگر یہ مطلب ہے تو میں کہوں گا کہ آخر غور و فکر کیوں نہ کیا جائے؟ یہ آخر غور و فکر کی طاقتیں ہمیں ملی کس لئے ہیں؟

ہمارے کان نہ ہوتے، آنکھیں نہ ہوتیں، دماغ نہ ہوتا تو بیشک سوچنے کا کوئی سوال نہ تھا، مگر جب ہم کو غور و فکر کی صلاحیتیں ملی ہوئی ہیں تو غور و فکر سے روکنے کی بنیاد؟

حالانکہ دنیا کی ترقی کا تمام سرمایہ اس وقت یہی ہے کہ ہر ایک چیز کی تحقیق کی جائے تو کیا یہ بغیر غور و فکر کے ممکن ہے؟ اگر انسان کو سوچنے کی ضرورت نہیں تو پھر یہ مدارس تعلیم کیلئے کیوں قائم ہیں؟ یہ یونیورسٹیاں کس لئے ہیں؟ یہ تعلیمات پر بیدریغ روپیہ کیوں صرف کیا جاتا ہے؟ نئی نئی قسم کی تجربہ گاہیں کیوں قائم ہوا کرتی ہیں؟ اسی لئے تو، کہ انسان اپنے دماغ کا دروازہ کھولے، جو باتیں اسے معلوم نہیں انہیں معلوم کرے اور حقیقتوں کو پہچانے۔

پھر مذہبی حقیقتوں نے کیا قصور کیا ہے؟ انہیں کیوں نہ سمجھا جائے؟

ذرا ہمارے موجودہ دور کے جو تعلیمی مباحث ہیں ان پر غور کیجئے۔ جن میں ہمارے طلاب کا امتحان ہوتا ہے۔ جن کے بارے میں سوالات آتے ہیں اور جن کے حل کرنے اور نہ کرنے پر ان کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر کسی ایسے شہر کی مردم شماری، وہاں کی پیداوار اور وہاں کے حالات جہاں اس کو کبھی نہیں جانا ہے، کوہ ہمالیہ کی

سب سے بڑی چوٹی کا ارتفاع جہاں اسے کبھی نہیں چڑھنا ہے، فلاں سمندر کی گہرائی جس میں اس کو کبھی نہیں اترنا ہے - یہ تمام چیزیں آپ کے امتحانات کے سوالات ہیں، تحقیق ہوتی ہے ہندوستان میں بیٹھ کر کہ چین کا تمدن اب سے دو ہزار برس پہلے کیا تھا جبکہ وہ نہ مکان کے اعتبار سے ہم سے متعلق ہے نہ زمان کے اعتبار سے - ایسی ہی بہت سی ان چیزوں کا جن سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں معلوم کرنا ہمارے لئے سرمایۂ اعزاز ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی یہ سوچے کہ ہمیں اس دنیا کے بعد کہاں جانا ہے تو دقیانوسی کا خطاب مل جائے - دو ہزار برس پہلے کا چین کا تمدن معلوم کیجئے تو انعام واکرام کے مستحق اور اگر یہ سوچیں کہ ہمارا آغاز کیا تھا! تو کہا جائے یہ مذہب کی بات ہے، رجعت پسندی کا مظاہرہ ہے - اس کو نہ سوچو کہ تمہارا مبدا کیا ہے اور تمہارا مستقبل کیا ہوگا؟

ہندوستان میں بیٹھ کر جمہوریۂ امریکہ کے دستورِ حکومت پر غور کریں اور اس پر تبصرہ کریں تو یہ علمی مسئلہ ہو اور خود ہمارے لئے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے کوئی قانون ہے، جس پر ہمیں کاربند ہونا چاہئے، اس پر غور کریں تو کہا جائے یہ مولویوں کی باتیں ہیں۔

پارلیمنٹ اور قانون ساز مجلس میں بیٹھ کر ہمارے ہی ایسے جائز الخطا انسان جو قانون بنا دیں اس کو آمنا و صدقنا کہہ کر تسلیم کریں اور روشن خیالی کے خلاف نہ ہو۔ مگر خالق کائنات کے احکام میں کہا جائے کہ جب تک ہم اپنی عقل سے سمجھ نہ لیں

کیونکر تسلیم کریں۔ یہ سب آخر کیا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ مذہب کو اس لئے ختم کر دینا چاہیئے کہ اس سے آزادی میں فرق آجاتا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ مطلق آزادی تو اس وقت تک نصیب نہیں ہوسکتی جب تک قیدِ ہستی سے رہا نہ ہو جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ وجود خود پابندیوں کا مرکز ہے اور جتنا وجود کا قدم آگے بڑھیگا اتنا پابندیوں میں اضافہ ہی ہوگا کمی نہیں ہوسکتی۔

دنیا کی چیزوں میں سب سے نیچے جمادات کا درجہ ہے۔ ان کی پابندیاں بھی کم ہیں بس ایک جگہ چاہیئے جس پر ٹھہریں اور ایک فضا چاہیئے جس میں سمائیں۔

ان کے بعد نباتات کی منزل ہے۔ یہ جسمیت کے ساتھ ساتھ نشو ونما کی صلاحیت کے حامل ہیں۔ اس منزل پر پہنچکر یہ نہیں ہوا کہ پہلے والی پابندی ختم ہو جائے بلکہ اس میں اضافہ ہو گیا۔ نباتات کو بھی ٹھہرنے کے لئے جگہ اور سمانے کے لئے فضا کی ضرورت ہے مگر اب اس کے علاوہ پانی کی بھی ضرورت ہے، جو جس پودے یا کھیتی کی غذا ہو، کھاد کی حیثیت سے اس کی بھی ضرورت ہے روشنی کی ضرورت ہے، ہوا کی ضرورت ہے۔ آفتاب کی حرارت کی ایک خاص تناسب کے ساتھ ضرورت ہے۔

اس سب کے بغیر ان کی زندگی برقرار نہ رہے گی۔ وہ نما

ہو جائیں گے۔ فنا کس معنی سے ؟ مادی نقطۂ نظر والے کہتے رہے ہیں کہ کسی شئے کو فنا نہیں ہے اس لحاظ سے کہ مادہ جتنا پیدا ہوا ہے اتنا ہی رہتا ہے نہ اس میں رتّی بھر زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی۔ حالانکہ اب یہ بھی غلط ثابت ہو رہا ہے۔ مگر خیر اس کو مان کر بھی ہم کہتے ہیں کہ فنا ہو جائے گا اس معنی سے کہ جو بلندی کا درجہ اسے حاصل تھا بحیثیت نباتات وہ نہ قائم رہے گا، وہ خاک ہو جائے گا، مٹی میں مل جائے گا، وہ درخت یا کھیت، تو نہ رہے گا، وہ گھاس تو باقی نہ رہے گی جب تک کہ وہ ضروریات پورے نہ ہوں، جو اس کی حیات کے لئے پورے ہونا چاہئیں۔

تیسری منزل حیوان کی ہے۔ اس میں جسمیت اور نشوونما کے علاوہ احساس و حرکت ارادی کا بھی جوہر ہے۔ یہ آنکھوں سے دیکھتا ہے، کانوں سے سنتا ہے اور چلتا پھرتا ہے مگر یہ ترقی کا درجہ بھی اپنے ساتھ آزادی نہیں بلکہ اور پابندیاں لاتا ہے۔ وہ سب پابندیاں پہلے کی تو قائم رہتی ہی ہیں اب اس احساس کی طاقت کے کارفرما ہونے کے لیے مزید ضروریات کی طلب ہے۔ سامع ہے تو اس کے ساتھ مخصوص شرائط، فضا ہو۔ ہوا ہو، درمیان میں اتنا فاصلہ ہو کہ ہوا کو آواز کی سفارت کا کام انجام دینے کا موقع ہو۔ اگر فاصلہ اتنا زیادہ ہوا کہ ہوا کی لہریں پہنچتے پہنچتے کمزور ہو گئیں تو سنائی نہ دیگا اور اگر فاصلہ اتنا کم ہوا کہ ہوا کو تموّج کی گنجائش ہی نہ ہوئی تو

سنائی نہ دے گا۔ لہٰذا معتدل فاصلہ ہو۔ جب ایسا ہوگا تو اسی وقت کان کام کریں گے۔ اسی طرح آنکھوں کے لئے روشنی ہو، رنگ ہو تب وہ کام کریں۔ پھر احساس کے بقا کے لئے ایک بڑی پابندی یہ ہے کہ اس قوت سے کام لیا جاتا رہے۔ جس طرح بعض لوگ اپنا ہاتھ خشک کر لیتے ہیں۔ یہ کیونکر خشک ہو جاتا ہے؟ جب مدت تک اس ہاتھ سے کوئی کام نہیں لیا جاتا وہ ہاتھ خشک ہو جاتا ہے اور اس کی طاقت ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ اسی طرح اگر آنکھیں نہ کھولی جائیں اور ایک مدت تک بند رہیں تو آنکھیں بیکار ہو جائیں گی اور قوت باصرہ جواب دے دیگی۔

وہ ہاتھ جس سے کام نہ لیا گیا اور وہ خشک ہو گیا، ظاہری طور پر اس جسم سے متصل رہتا ہے، رگوں کا جال ہے جو اسے بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ جلد کا غلاف ہے جو اس پر بھی چڑھا ہوا ہے۔ مگر چونکہ جزو نے کل کا کام چھوڑ دیا تو کل نے برکات حیات سے اسے محروم کر دیا۔ اب خون کی گردش وہاں تک پہنچ کر راستا بدل دیتی ہے۔ حرارت حیات تمام جسم میں پھیلتی ہے اور اس حصہ جسم سے دامن بچا لیتی ہے۔ معلوم ہوا کہ زندگی قائم رکھنے کے لئے زندگی کے کاموں کا جاری رکھنا لازم ہے — ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑی پابندی ہے۔ مگر بقائے حیات کے لئے یہ پابندی ناگزیر ہے۔

اب حیوان کے بعد انسان کی منزل ہے۔ یہاں سب سے بلند ہے

پھر جب یہاں تک ہم نے دیکھ لیا کہ ہر بلندی اپنے ساتھ کچھ پابندیاں لاتی ہے تو اب انسانی رفعت کی منزل پر پہنچ کر آزادی مطلق کا نعرہ کہاں درست ہو گا - بلکہ فطری امر یہی سمجھنا چاہیے کہ جس طرح اس کے پہلے کی ہر منزل کچھ پابندیوں کے ساتھ وابستہ تھی اسی طرح یہ بلندی بھی اپنے ساتھ کچھ پابندیاں ہی لاتی ہے - کہ اگر انسان ان پابندیوں کو پورا نہ کرے تو جسم باقی رہیگا نشو و نمائے نباتی برقرار رہے گی - حیات حیوانی قائم رہے گی مگر انسانی رفعت ختم ہو جائے گی - انسانیت محفوظ نہیں رہے گی اسی پابندی کو جو بقائے انسانیت کے لحاظ سے عائد ہوتی ہے "مذہب" کہتے ہیں -

یہ کتنی بے اصول بات ہے کہ آدمی جسمانیت کے اعتبار سے جو پابندیاں ہیں ان سے نجات حاصل نہیں کر سکتا - نشو و نما کے لحاظ سے جو پابندیاں ہیں ان سے چھٹکارا نہیں پا سکتا - حیوانیت کے اعتبار سے جو پابندیاں ہیں ان سے مفر نہیں پاتا اور صرف ان پابندیوں کو ختم کرنا چاہتا ہے جو انسانیت کے تحفظ کے لئے اس پر عائد ہیں - ان کے مقابلہ میں وہ آزادی کا نعرہ لگاتا ہے

پھر آزادی جس کا مطالبہ ہے، اس کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ جو کچھ اس کی خواہش ہو وہ اسے حاصل کر سکے - مگر انسان ایک فرد کا تو نام نہیں ہے - انسان تو ایک نوع ہے - جس میں کا ہر فرد انسان

ہے اور ہر ایک کی خواہشیں لا محدود ہیں۔ اس کو آپ روز مرہ کی مثالوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً ہم میں سے جو کبیر السن افراد ہیں ان میں سے اکثر کو کہتے سنا ہے کہ اس دنیا میں ہماری سب حسرتیں پوری ہو گئیں مگر یہ ایک حسرت باقی ہے۔ مثلاً کوئی بچہ کمسن ہے تو وہ کہتے ہیں، بس حسرت یہ ہے کہ یہ بچہ اپنے ہاتھ منہ کا ہو جائے۔ جب اللہ نے یہ دن دکھایا، وہ اپنے ہاتھ منہ کا ہو گیا تو انہوں نے کہا "اللہ نے سب حسرتیں پوری کر دیں بس اب اس کے سر پر سہرا دیکھ لیں۔ یہ تمنا ہے" جب بچہ کے سر پر سہرا بندھ گیا تو پھر کہتے ہیں کہ بس اب اس کا ایک ہنستا کھیلتا بچہ دیکھ لیں۔ اب جب ماشاء اللہ وہ بچہ سامنے آ گیا تو انہی حسرتوں کا سلسلہ اب اس بچہ کے متعلق شروع ہو گیا۔ غرض عمر گزر جاتی ہے اور یہ ایک حسرت رہ جاتی ہے۔

اسی کو اقتصادی دائرہ میں دیکھ لیجئے کہ ایک معمولی کلرک جسے پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی اسے کہتے سنا گیا کہ خدا کا شکر ہے گزر بسر تو ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر دس روپیہ کا تنخواہ میں اضافہ ہو جائے تو زندگی آرام سے گزرنے لگے۔ لیکن تنخواہ میں اضافہ ہو گیا تو وہی دس کی کمی پھر بنی۔ اب جس کی آمدنی دہائیوں کے حساب سے ہوتی ہے اس کو ایک دہائی کی کمی محسوس ہوتی ہے اور جن کی سینکڑوں کے حساب سے آمدنی ہے ان کو پورے سَو کی کمی معلوم ہوتی ہے اور جن کی ہزاروں کے حساب سے آمدنی ہے انکو ایک

ہزار کی کمی، غرض یہ وہ پیاس ہے کہ جتنا اسے بجھایا جائے یہ اتنی بھڑکتی ہے۔

یہی جذبہ جب اور اونچے حلقہ میں جاتا ہے تو فتح ممالک کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ جس کے پاس ایک ملک ہے وہ کہتا ہے کہ یہ ملک میری رعایا کے لئے ناکافی ہے۔ تھوڑی سی جگہ اور ہو تو کافی ہو لیکن وہ تھوڑی سی جگہ تو کسی دوسرے کے پاس ہی ہو گی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس غرض کے لئے دوسرے ملک پر حملہ کرتا ہے اور جب اس کو فتح کر لیتا ہے تو پھر یہ رقبہ ناکافی ہوتا ہے اور اسی طرح برابر یہی خواہش رہتی ہے کہ "جہاں میں جہاں تک جگہ پائیے عمارت بناتے چلے جائیے"

اسی کا ایک درجہ یہ ہے کہ جب ساری دنیا پر بلا واسطہ یا بالواسطہ اپنا اقتدار قائم ہو گیا تو توجہ مریخ کی طرف جاتی ہے۔ دوسرے سیاروں کی طرف خیال جاتا ہے کہ وہاں بھی آبادی ہے یا نہیں یہ بھی درحقیقت اقتدار کے اضافہ کی خواہش ہے۔

اب جبکہ ہر ایک انسان کی خواہشیں لامحدود ہیں تو یا تو بس ایک کو آزاد کر دیا جائے اور سب کو قید۔ مگر یہ وہی کرے گا جسے اس ایک کے ساتھ مخصوص طور پر رشتہ داری ہو اور یا پھر یہ ہونا چاہئے کہ یہ آزادی کی جنس حصہ رسدی تقسیم ہو۔ یعنی ہر ایک وہاں تک آزاد ہو جہاں تک کہ دوسروں کے حقوق کو صدمہ نہ پہنچے اور جہاں سے

دوسروں کے حقوق کو صدمہ پہنچتا ہو وہیں سے پابندی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان حقوق کی تقسیم کا مرکز کون ہو؟

اگر یہ کوئی مادی مرکز ہوا تو محدود ہوگا۔ کچھ سے نزدیک ہوگا اور کچھ سے دور۔ جن سے دور ہوگا ان کے ضروریات کا احساس بھی کم ہوگا اور ان کی طرف رجحان طبع بھی کم ہوگا۔ لٰہذا حقوق آزادی کی تقسیم ایک غیر مادی مرکز سے وابستہ ہونا چاہیئے جو کسی سے کم کسی سے زیادہ واسطہ نہ رکھتا ہو۔ بلکہ ہر ایک کے ساتھ برابر اور یکساں تعلق رکھتا ہو۔ اسی قانون کو جو اس ذاتِ لامحدود کی طرف سے ہو مذہب پیش کرتا ہے اور اسی کا نام "شریعت" ہوتا ہے۔

نعرہ لگانا تو آسان ہے کہ ہمیں آزادی مطلق ملنا چاہئے مگر کبھی ایک دن کے لئے بھی آزاد ہو کر ذرا دکھایا تو جائے۔ عالم تو یہ ہے کہ آپ اپنے شہر کی ایک سڑک پر چلنے میں آزاد نہیں، ہر سڑک پر سواریوں کے آنے جانے کے لئے قانون مقرر، راستے معین مڑنے میں دائیں یا بائیں کی تخصیص۔ بڑے شہروں میں دیکھیئے تو چوراہوں پر چبوترے بنے ہوئے۔ چبوتروں پر کھمبے نصب۔ کھمبے کے پاس ایک سپاہی کھڑا ہوا، جو آنے جانے والی سواریوں کو اشارے کر رہا ہے۔ کسی کو روک دیتا ہے، کسی کو آگے بڑھا دیتا ہے۔

یہ سب کس لئے؟ فقط اس لئے کہ سڑک ایک ہے اور راستا

چلنے والے بہت ہیں۔ پھر ان کے بھی ذرائع مختلف اور قوتیں جداگانہ ہیں۔ کوئی موٹر پر سوار ہے کوئی تانگے پہ، کوئی سائیکل نشین ہے اور کوئی بے چارہ پیادہ۔ پھر راہگیروں میں کوئی جوان ہے کوئی بوڑھا کوئی بچہ اور کوئی پردہ نشین عورت اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے مطلب سے مطلب ہے اور اپنی منزل تک پہنچنے کی دھن ہر ایک ایسا محسوس کرتا ہے جیسے اسی کو سب سے زیادہ جلدی پہنچنا ہے۔ اب اگر ان تمام کو راستا چلنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو سواریاں پیادوں کو کچل دیں گی۔ جوان بوڑھوں کو دھکا دینگے بچے پیروں کے نیچے آجائیں گے۔ عورتوں کے وقار کو صدمہ پہنچے گا اور اگر دونوں طرف موٹریں ہوئیں تو خوب ٹکریں لڑیں گی اور دونوں کی تباہی ہوگی۔ اس کے لئے ضرورت ہوئی کہ راستا چلنے والوں کے لئے قانون ہو۔ حالانکہ یہ سڑک، اس کے چلنے والے محدود ہیں اور وہ آنکھوں کے سامنے ہیں، پھر بھی بغیر قانون اس کا طے کرنا درست نہیں تو یہ عظیم الشان راہِ حیات جس پہ چلنے والے افراد نہیں بلکہ اقوام۔ کیا اس پہ چلنے کے لیے کسی قانون کی ضرورت نہ ہوگی۔ مذہب وہی قانون ہے جو سب کی رفتارِ عمل میں توازن و اعتدال پیدا کرے اور تصادمات کا سدِباب کرے

پھر یہ دیکھئے کہ ہو سکتا تھا قانون کاغذ پہ لکھ کر اس کھمبے پہ چسپاں کر دیا جاتا۔ سپاہی کی ضرورت کیا تھی؟ مگر یہ کافی نہیں ہے اس

لئے کہ یہ چلنے والے جو اپنی رَو میں آرہے ہیں انہیں کون کہتا کہ وہ ٹھہریں اور کاغذ پہ لکھے ہوئے قانون کو دیکھیں بھی۔ فرض کیجئے وہ اس قانون کو دیکھ بھی لیتے تو اپنے مطلب کی خاطر ہر ایک اپنی مرضی کے مطابق اس کا مطلب بنا لیتا۔ بعد میں وکلاء اس پہ بحث کرتے اور دلائل پیش کر کے ثابت کرتے کہ یہ مطلب صحیح ہے یا غلط مگر یہ تو بعد کو ہوتا۔ تصادم اسی وقت ہو جاتا۔ معلوم ہوا کہ اس ایک سڑک کے لئے بھی کتابی قانون کافی نہیں ہے۔ بلکہ ایک شخص کی ضرورت ہے جو اس قانون پہ عمل کراتا رہے۔ اسی طرح شاہراہ حیات پر چلنے کے لئے بھی ایک طرف قانون کی ضرورت ہے جس کو شریعت کہتے ہیں اور دوسری طرف ایک ناطق رہنما کی ضرورت ہے جو اس کا مطلب سمجھاتا رہے اور اس پہ عمل کراتا رہے۔ یہی رہنما انبیاء و مرسلین اور ائمہ دین علیہم السلام ہوتے ہیں۔

اب یہیں پہ یہ دیکھ لیجئے کہ جب وہ پورا ہے کا سپاہی آپ کو ہاتھ کے اشارے سے کہے، اس سے کبھی آپ کہتے ہیں "کیوں؟" حالانکہ یہ دور تحقیق کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہم کسی چیز کو اس وقت تک نہیں مانتے جب تک سمجھ نہ لیں۔ مگر کبھی کوئی اس سپاہی سے نہیں پوچھتا کہ کیوں؟ اور اگر دل چاہے تو کبھی پوچھ کر دیکھئے کہ کیا ہوتا ہے؟ وہ جواب دیگا کہ تمہارا کام عمل کرنا ہے "کیوں"

کا پوچھنا تمہارا کام نہیں۔

بے شک یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ سپاہی جو کھڑا ہوا ہے اسی حکومت کی طرف کا ہے جسے ہم تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔ اس کے لئے تمغہ دیکھ لینا چاہیئے، نمبر دیکھ لینا چاہیئے، جو علامتیں اس سپاہی کی ہوتی ہیں ان پر نظر کر لینا چاہیئے۔ اگر معلوم ہو کہ کوئی دوسرا شخص اس سپاہی کی جگہ کھڑا ہو گیا ہے تو ہرگز اس کی بات پر عمل نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کی اطلاع نزدیک کے پولیس اسٹیشن پر دے کر اس کو گرفتار کرا دینا چاہیئے۔

اسی لئے اصولِ دین میں تقلید نہیں ہے اور مدعی نبوت کو صرف دعوے کی بنا پر نبی نہیں مانا جا سکتا بلکہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ معجزہ نبی و رسول کے لئے اسی بنا پر لازم ہے۔ مگر جب یہ سمجھ لیا کہ نبی ہے اور خالق کا نمائندہ ہے تو اب اس کے احکام کے ماننے میں چون و چرا کرنا غلط ہے۔ اب یہ سوال کرنا کہ صبح کی دو رکعت نماز کیوں ہے۔ ظہر اور عصر کی چار کیوں، مغرب کی تین اور عشاء کی چار کس لئے؟ احکامِ شریعت کو تعبدی کہنے کے یہی معنی ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت ان احکام میں کچھ عقلی مصالح ہیں ہی نہیں، چونکہ شارع مقدس حکیم علی الاطلاق ہے تو اس کے احکام میں حکم و مصالح تو بہر حال ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ خصوصی

حکمتیں ہماری سمجھ میں بھی آجائیں ۔ ہمیں تو تعمیل اس لئے کرنا ہے
کہ وہ خالق کا حکم ہے اور بس ۔

اب رہ گئے وہ اعتراضات ، جو مذہب کے خلاف کئے
جاتے ہیں ۔ مثلاً یہ کہ مذہب جنگ کراتا ہے ، خونریزی کا سبب ہوتا ہے
سرمایۂ فساد ہے وغیرہ وغیرہ تو یہ اعتراضات حقیقتہً اصل مذہب
سے متعلق نہیں ہیں کیونکہ مذہب کی اصل تعلیم کبھی بھی خونریزی نہیں ہے ۔
بلکہ اس کا تعلق اہل مذاہب کے طرزِ عمل سے ہے ۔
کوئی شک نہیں کہ اہلِ مذاہب نے دنیا میں بڑی بڑی خونریزیاں
کی ہیں مگر یاد رکھنا چاہیے کہ مذہب اور شے ہے اور اہلِ مذہب کا کردار
دوسری شے ہے اور یہ خطِ فاصل بڑے نمایاں طور پر حضرت امام حسینؑ
نے کربلا میں اپنے خونِ پاک سے جو ناحق بہایا جا رہا تھا کھینچ دیا ہے
انہوں نے ثابت کر دیا کہ دیکھو مسلمانوں کی اتنی عظیم اکثریت ایک
طرف ہے اور پیغمبرِ اسلام کے تعلیمات کا وارث ایک جانب
ہے ۔
اگر اہلِ مذاہب کا کردار ہی عین مذہب ہوا کرتا تو بانیٔ اسلام کے نواسے
کو جو اس مذہب کا مکمل مجسمہ تھا اس قربانی کے پیش کرنے کی ضرورت
کیوں پیش آتی ؟

علی نقی النقوی

(مطبوعہ: نظامی پریس لکھنؤ)